تقلیدِ شرعی کی حقیقت، اقسام، ضرورت، درجات اور اُن کے احکام
نیز چند اہم شبہات کا اِزالہ

تقلید کی شرعی حیثیت
(خلاصہ)

افادات

شیخ الاسلام فقیہ العصر شیخ الحدیث

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

جمع وترتیب:

محمد ارمغان ارمان

تقلید کی شرعی حیثیت

افادات: شیخ الاسلام فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی
جمع و ترتیب: محمد ارمغان ارمان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ، اَمَّا بَعۡدُ!

فرقۂ غیر مقلدین جو ''عمل بالحدیث'' کے دعوے دار اور ''اہلِ حدیث'' کے نام سے موسوم ہیں؛ مگر عملاً بہت سی صحیح احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ تقلید کو شرک وحرام کہتے ہیں؛ جبکہ خود اپنی جماعت کے نام نہاد علماء اور اُردو تراجم کتب کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے آپ کو ''سلفی'' کہلاتے ہیں؛ مگر اُمت کے اکابر و اسلاف یعنی ائمہ مجتہدین، فقہاء، علماء، صوفیاء اور صالحین (حتیٰ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی بے ادبی و گستاخی اور توہین وتذلیل کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔

عوام الناس کی سادہ لوحی و کم علمی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ''قرآن وحدیث'' کے نام پر اپنے آزاد مشرب ومؤقف کو رائج وعام کررہے ہیں، اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ صرف اہلِ حدیث ہی راہِ حق پر ہیں اس کے برخلاف اہلِ سنت والجماعت یعنی ائمہ اربعہ اور ان کے مقلدین گمراہ اور مشرک ہیں۔ یوں اُمتِ مسلمہ میں اتفاق واتحاد کے بجائے افتراق وانتشار اور لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں، اس کا مشاہدہ احقر کو کئی متاثر حضرات سے بالمشافہ ملاقات ہوا ہے۔

عوام الناس کی اس حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس بارے کچھ مختصر سا لکھ دیا جائے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''جب فتنے ظاہر ہو جائیں اور بدعات کا شیوع ہونے لگے، تو عالم کو چاہیے کہ علم کو خوب پھیلائے اور جہل کا مقابلہ قوتِ علم سے کرے''۔

الحمدللہ! مسئلہ ''تقلید واجتہاد'' اور اس پر کیے گئے اعتراضات وشبہات کے جوابات پر بے شمار کتابیں مفصل ومدلل لکھی جا چکی ہیں، اُنھی میں سے ایک نمونۂ اسلاف شیخ الاسلام فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی ''تقلید کی شرعی حیثیت'' بھی ہے جو کہ مختصر مگر نہایت جامع، آسان زبان اور اکابرو اسلاف اہلسنّت والجماعت کے مؤقف کی صحیح ترجمان ہے۔ اس لیے اس کتاب کا خلاصہ حضرت مدظلہم ہی کے الفاظ میں اِفادۂ عام کی غرض سے پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ تقلید کی حقیقت وضرورت اور ترکِ تقلید کے مضرات سے آگاہی ہو، تفصیل اور دلائل کے لیے اصل کتاب کی طرف رُجوع کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اس کوشش کو اپنی بارگاہِ عالی میں قبول فرمائے اور اُمتِ مسلمہ کے نافع بنائے، آمین۔

خاکپائے اختؔر ومظہؔر

محمد ارمغان ارمانؔ

تقلید کی حقیقت:

اس بات سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہوسکتا کہ دین کی اصل دعوت یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی اس لیے واجب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے احکامِ الٰہی کی ترجمانی فرمائی ہے، کون سی چیز حلال ہے؟ کون سی چیز حرام؟ کیا جائز ہے؟ کیا ناجائز؟ ان تمام معاملات میں خالصۃً اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنی ہے، اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے کسی اور کی اطاعت کرنے کا قائل ہو اور اس کو مستقل بالذات مُطاع سمجھتا ہو، وہ یقیناً دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے احکام کی اطاعت کرے۔

لیکن قرآن وسنت میں بعض احکام تو ایسے ہیں کہ جنھیں ہر معمولی لکھا پڑھا آدمی سمجھ سکتا ہے، ان میں کوئی اِجمال (اختصار)، اِبہام (غیر واضح) یا تعارض (مخالفت، باہمی ضد) نہیں ہے، بلکہ جو شخص بھی انہیں پڑھے گا وہ کسی اُلجھن کے بغیر اُن کا مطلب سمجھ لے گا۔ (ص:۷)

جیسے: پانچ نمازیں، زکوٰۃ، روزے اور حج وغیرہ کی فرضیت، اور زنا، لواطت، شراب نوشی، چوری اور قتل وغیرہ کی حرمت۔ قرآن وسنت کے ان متفقہ اور قطعی احکام میں کسی اجتہاد وتقلید کی ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ ہی جائز ہے، کیونکہ اس میں کوئی پیچیدگی اور اشتباہ نہیں۔

اس کے برعکس قرآن وسنت کے بہت سے احکام وہ ہیں جن میں کوئی اِبہام یا اِجمال پایا جاتا ہے، اور کچھ ایسے بھی ہیں جو قرآن ہی کی کسی دوسری آیت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی کسی دوسری حدیث سے متعارض معلوم ہوتے ہیں۔ (ص:۸) جیسے: عبادات اور معاملات وغیرہ کے فروعی مسائل، جن میں اجتہاد کیا جاتا ہے اور علماء کا اختلاف ہوتا ہے۔

اب قرآن وحدیث سے احکام کے مستنبط کرنے کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی فہم وبصیرت پر اعتماد کر کے اس قسم کے معاملات میں خود کوئی فیصلہ کر لیں اور اس پر عمل کریں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے یہ دیکھیں کہ قرآن وسنت کے ان ارشادات سے ہمارے جلیل القدر اسلاف نے کیا سمجھا ہے؟ چنانچہ قرونِ اولیٰ کے جن بزرگوں کو ہم علومِ قرآن وسنت کا زیادہ ماہر پائیں، ان کی فہم وبصیرت پر اعتماد کریں اور انھوں نے جو کچھ سمجھا ہے اس کے مطابق عمل کریں۔ (ص:۹، ۱۰)

ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت خاصی خطرناک ہے، اور دوسری صورت بہت محتاط۔ (چند وجوہات ذکر کرنے کے بعد فرمایا) ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اگر ہم اپنی فہم پر اعتماد کرنے کے بجائے قرآن وسنت کے مختلف التعبیر پیچیدہ احکام میں اس مطلب کو اختیار کر لیں جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے، تو کہا جائے گا کہ ''ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے''۔ یہ ہے تقلید کی حقیقت۔ (ص:۱۰)

یہ بات واضح ہوگئی کہ: کسی امام یا مجتہد کی تقلید صرف اس موقع پر کی جاتی ہے جہاں قرآن وسنت سے کسی حکم کے سمجھنے میں کوئی دُشواری ہو۔ (ص:۱۰)

کسی امام یا مجتہد کی تقلید کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اُسے بذاتِ خود واجب الاطاعت سمجھ کر اتباع کی جارہی ہے، یا اُسے شارع (شریعت بنانے والا، قانون ساز) کا درجہ دے کر اس کی ہر بات کو واجب الاتباع سمجھا جارہا ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ پیروی تو قرآن وسنت کی مقصود ہے، لیکن قرآن و سنت کی مراد کو سمجھنے کے لیے بحیثیت شارحِ قانون اُن کی بیان کی ہوئی تشریح وتعبیر پر اعتماد کیا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت کے قطعی احکام میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید ضروری نہیں سمجھی گئی، کیونکہ وہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا اصل مقصد اس کے بغیر بآسانی حاصل ہوجاتا ہے۔ (ص:۱۳، ۱۴)

مقلد اپنے امام کے قول کو مآخذِ شریعت نہیں سمجھتا، کیونکہ مآخذِ شریعت صرف قرآن وسنت (اور انہی

کے ذیل میں اجماع وقیاس) ہیں، البتہ یہ سمجھ کر اس کے قول پر عمل کرتا ہے کہ چونکہ وہ قرآن وسنت کے علوم میں پوری بصیرت کا حامل ہے اس لیے اس نے قرآن وسنت سے جو مطلب سمجھا ہے وہ میرے لیے زیادہ قابلِ اعتماد ہے (اور اسی اعتماد کا نام ''تقلید'' ہے)۔

اب آپ بہ نظرِ انصاف غور فرمائیے کہ اس عمل میں کون سی بات ایسی ہے جسے 'گناہ' یا ''شرک'' کہا جا سکے؟ یاد رکھئے! جس طرح تقلید کی مخالفت اور شرعی مسائل میں خود رائی قابلِ ملامت ہے، اسی طرح تقلید میں جمود اور غلو بھی قابلِ مذمت ہے۔ (ص:۱۴، ۱۵۶)

تقلید کی دو صورتیں:

ایک تو یہ کہ تقلید کے لیے کسی خاص امام ومجتہد کو معین نہ کیا جائے، بلکہ اگر ایک مسئلہ میں ایک عالم کا مسلک اختیار کیا گیا ہے تو دوسرے مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کر لی جائے، اس کو ''تقلیدِ مطلق'' یا ''تقلیدِ عام'' یا ''تقلیدِ غیر شخصی'' کہا جاتا ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ تقلید کے لیے کسی ایک مجتہد عالم کو اختیار کیا جائے، اور ہر ایک مسئلہ میں اسی کا قول اختیار کیا جائے، اُسے ''تقلیدِ شخصی'' کہا جاتا ہے۔

تقلید کی ان دونوں قسموں کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک شخص براہِ راست قرآن و سنت سے احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ جس مجتہد کو قرآن وسنت کے علوم کا ماہر سمجھتا ہے اس کی فہم وبصیرت اور اس کے تفقہ پر اعتماد کر کے اس کی تشریحات کے مطابق عمل کرتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کا جواز بلکہ وجوب قرآن وسنت کے بہت سے دلائل سے ثابت ہے۔ (ص:۱۵)

چنانچہ صحابہ کرام میں سے جو حضرات اپنے آپ کو اہلِ استنباط واجتہاد نہیں سمجھتے تھے وہ فقہاءِ صحابہ سے رجوع کرتے وقت اُن سے دلائل کی تحقیق نہیں فرماتے تھے، بلکہ اُن کے بتائے ہوئے مسائل پر اعتماد کر کے عمل فرماتے تھے۔ (ص:۳۴)

قرآن وسنت سے چند دلائل اور عہدِ صحابہ وتابعین میں تقلیدِ مطلق وتقلیدِ شخصی پر عمل کی چند مثالیں پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ: غرض مندرجہ بالا روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تقلید کی دونوں قسموں (شخصی اور غیر شخصی) پر صحابۂ کرام کے عہدِ مبارک میں عمل ہوتا رہا ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن وسنت سے براہِ راست احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، اصل کے اعتبار سے اس کے لیے تقلید

کی دونوں قسمیں جائز اور درست تھیں۔(ص:۵۹)

''تقلیدِ شخصی'' کی ضرورت:

تقلید پر عمل کرنے کے لیے ''تقلیدِ مطلق'' یا ''تقلیدِ شخصی'' میں سے جس صورت پر بھی عمل کر لیا جائے، اصلاً جائز ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ رحمتیں نازل فرمائے ہمارے بعد کے فقہاء پر جو اپنے اپنے زمانے کے نبض شناس تھے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر نگاہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، انھوں نے بعد میں ایک زبردست انتظامی مصلحت کے تحت تقلید کی مذکورہ دونوں قسموں میں سے صرف ''تقلیدِ شخصی'' کو عمل کے لیے اختیار فرمالیا، اور یہ فتویٰ دے دیا کہ:

اب لوگوں کو صرف تقلیدِ شخصی پر عمل کرنا چاہیے، اور کبھی کسی امام اور کبھی کسی امام کی تقلید کے بجائے کسی ایک مجتہد کو متعین کر کے اسی کے مذہب کی پیروی کرنی چاہیے۔(ص:۶۰،۶۱)

وہ زبردست ''انتظامی مصلحت'' کیا تھی؟ بطورِ تمہید پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ''خواہش پرستی'' وہ زبردست گمراہی ہے جو بسا اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے، اسی لیے قرآن وحدیث میں بے شمار مقامات پر خواہش پرستی کی مذمت اور اس سے دامن بچانے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔خواہش پرستی کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ انسان بُرے کام کو بُرا اور گناہ کو گناہ سمجھے، مگر اپنے نفس کی خواہشات سے مجبور ہو کر اس میں مبتلا ہو جائے۔دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی غلامی میں اس حد تک پہنچ جائے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر ڈالے اور دین وشریعت کو کھلونا بنا دے۔

یہ دوسری صورت پہلی سے زیادہ سنگین، خطرناک اور تباہ کن ہے، کیونکہ پہلی صورت میں جرم پر نادم ہو کر توبہ کرنے کی اُمید رہتی ہے، اس کے برعکس دوسری صورت میں ایسا نہیں ہے۔

فقہاءِ کرام نے محسوس فرمایا کہ لوگوں میں دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے، احتیاط اور تقویٰ اُٹھتے جا رہے ہیں، ایسی صورت میں اگر تقلیدِ مطلق کا دروازہ چوپٹ کھلا رہا تو بہت سے لوگ جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مثلاً: ایک شخص کے سردی کے موسم میں خون نکل آیا، تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا، اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہیں ٹوٹا، وہ اپنی تن آسانی کی وجہ سے اس وقت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقلید کر کے بلا وضو نماز پڑھ لے گا۔پھر اُس کے تھوڑی دیر بعد اگر اس نے کسی عورت کو چُھو لیا، تو

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برقرار ہے، اس کی تن آسانی اس موقع پر اُسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقلید کا سبق دے گی، اور پھر وہ بلا وضو نماز کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔

غرض جس امام کے قول میں اُسے آرام اور فائدہ نظر آئے گا اسے اختیار کرے گا، اور جس قول میں کوئی مضرت نظر آئے یا خواہشات کی قربانی دینی پڑے اُسے چھوڑ دے گا، اور ایسا بھی ہوگا کہ اس کا نفس اسی قول کی صحت کی دلیلیں سُجھائے گا جو اُس کے لیے زیادہ آسان ہے اور وہ بالکل غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ احکامِ شرعیہ نفسانی خواہشات کا ایک کھلونا بن کر رہ جائیں گے، اور یہ وہ چیز ہے جس کے حرام قطعی ہونے میں آج تک کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہوا۔ (ص:۶۱، ۶۲)

اپنی خواہشاتِ نفس کے تابع ہو کر ایک چیز کو کبھی حلال اور کبھی حرام کر لینا اور جس مذہب میں نفسانی فائدہ نظر آئے اُسے اختیار کر لینا اتنا بڑا جرم ہے کہ وہ کسی کے نزدیک جائز نہیں۔ اس موضوع پر قرآن وحدیث کی نصوص اور علماءِ اُمت کی تصریحات بے شمار ہیں۔..... علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ اپنی خواہشات کے تابع ہو کر کبھی کسی کا اور کبھی کسی کا مذہب اختیار کر لینا باجماعِ اُمت ناجائز ہے۔

صحابہ وتابعین کے زمانے میں چونکہ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا غلبہ تھا، اس لیے اُس دَور میں ''تقلیدِ مطلق'' سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ لوگ اپنی خواہشات کے تابع ہو کبھی کسی مجتہد کا اور کبھی کسی مجتہد کا قول اختیار کریں گے، اس لیے اُس دَور میں ''تقلیدِ مطلق'' پر بے روک ٹوک عمل ہوتا رہا اور اُس میں کوئی قباحت نہیں سمجھی گئی۔ لیکن بعد کے فقہاء نے جب یہ دیکھا کہ دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے اور لوگوں پر نفسانیت غالب آتی اج رہی ہے تو اس وقت انھوں نے مذکورہ بالا انتظامی مصلحت سے یہ فتویٰ دیا کہ اب لوگوں کو صرف تقلیدِ شخصی پر عمل کرنا چاہیے اور ''تقلیدِ مطلق'' کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے۔ یہ کوئی شرعی حکم نہیں تھا، بلکہ ایک انتظامی فتویٰ تھا۔ (ص:۶۵)

مختلف مذاہب سے آسانیاں تلاش کر کے اُن پر عمل کرنا کیوں ناجائز ہے؟ اس سے کیا کیا مفاسد پیدا ہوتے ہیں؟ اور تقلیدِ شخصی کے رواج کے اسباب کیا ہیں؟ تفصیل کتاب ھذا میں دیکھئے۔ (ص:۶۹، ۷۰)

اگر تقلیدِ مطلق کی عام اجازت ہو اور ہر شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جس مسئلے میں جس فقیہ

کی چاہے تقلید کرلے تو اس قسم کے اقوال کو جمع کر کے ایک ایسا مذہب تیار ہوسکتا ہے جس کا بانی نفس اور شیطان ہوگا، اور دین کو اس طرح خواہشات کا کھلونا بنالینا کسی کے مذہب میں جائز نہیں ہے۔.....اسی بناء پر بعد کے فقہاء نے یہ فرمایا کہ اب تقلیدِ شخصی کی پابندی ضروری ہے اور کسی ایک مجتہد کو معین کر کے ہر مسئلے میں اسی کی پیروی کی جائے تاکہ نفسِ انسانی کو حلال وحرام کے مسائل میں شرارت کا موقع نہ مل سکے۔(ص:۶۸)

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کے دَور میں دیانت عام تھی جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے اُن کی نفسانیت اس قدر مغلوب تھی کہ خاص طور سے شریعت کے احکام میں انھیں خواہشات کی پیروی کا خطرہ نہیں تھا، اس لیے ان حضرات کے دَور میں تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی دونوں پر عمل ہوتا رہا، بعد میں جب یہ زبردست خطرہ سامنے آیا تو تقلید کو ''تقلیدِ شخصی'' میں محصور کر دیا گیا۔اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو احکامِ شریعت کے معاملہ میں جو افراتفری برپا ہوتی اس کا تصور ہم مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔(ص:۷۱)

چند شبہات کا ازالہ:

تقلیدِ شخصی کی حقیقت وضرورت واضح ہوجانے کے بعد دو مشہور شبہات کے جواب ملاحظہ ہوں:

(۱).....جو چیز عہدِ صحابہ وتابعین میں ضروری نہ تھی، بعد میں کیسے ضروری قرار دے دی گئی؟

جواب: حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں جمعِ قرآن کا واقعہ ''تقلیدِ شخصی'' کے معاملے کی ایک واضح نظیر ہے۔حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُمت کی جس اجتماعی مصلحت کی بناء پر ایسا کیا، وہی صورتِ حال تقلید کے معاملے میں بھی پیش آئی، لہٰذا اس عمل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اُمت کو کسی مقصد کے حصول کے لیے متعدد امور کا اختیار ملا ہو تو وہ زمانے کے فساد کے پیشِ نظر ان میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کر کے باقی طریقوں کو چھوڑ سکتی ہے، اور تقلیدِ شخصی کے معاملے میں اس سے زائد کچھ نہیں ہوا۔(ص:۷۸)

(۲).....اگر کسی بھی ایک امام کو معین کر کے اس کی تقلید کرنا ٹھہرا، تو پھر صرف ان چار اماموں کی کیا خصوصیت ہے؟ اُمت کے دوسرے مجتہدین کی تقلید کیوں نہیں کی جاتی؟

جواب: ان حضرات کے فقہی مذاہب مدوّن شکل میں محفوظ نہیں رہ سکے، اگر ان حضرات کے مذاہب بھی اس طرح مدوّن ہوتے جس طرح ائمہ اربعہ کے مذاہب مدوّن ہیں تو بلاشبہ ان میں سے کسی کو بھی

تقلید کے لیے اختیار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن نہ تو ان حضرات کے مذاہب کی مفصل کتابیں مدوّن ہیں، نہ ان مذاہب کے علماء پائے جاتے ہیں، اس لیے اب ان کی تقلید کی کوئی سبیل (راہ) نہیں ہے۔ (ص:۷۹)

تقلید کے درجات اور اُن کے احکام:

تقلید کرنے والے کے لحاظ سے تقلید کے چار مختلف درجات اور اُن کے احکام ہیں۔ ان درجات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور غیر مقلدین کے بیشتر اعتراضات اسی فرقِ مراتب کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ ان چار درجات کا سمجھنا بہت ضروری ہے، وہ بالترتیب یہ ہیں:

(۱) عوام کی تقلید (۲) متبحر عالم کی تقلید (۳) مجتہد فی المذہب کی تقلید (۴) مجتہد مطلق کی تقلید۔

(۱) عوام کی تقلید:

''عوام'' سے ہماری مراد مندرجۂ ذیل اقسام کے حضرات ہیں:

۱)۔ وہ حضرات جو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بالکل ناواقف ہوں، خواہ وہ دوسرے فنون میں وہ کتنے ہی تعلیم یافتہ اور ماہر و محقق ہوں۔

۲)۔ وہ حضرات جو عربی زبان جانتے اور عربی کتابیں سمجھ سکتے ہوں، لیکن انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ اور متعلقہ دینی علوم کو باقاعدہ اساتذہ سے نہ پڑھا ہو۔

۳)۔ وہ حضرات جو رسمی طور پر اسلامی علوم سے فارغ التحصیل ہوں، لیکن تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے اصولوں میں اچھی استعداد اور بصیرت پیدا نہ ہوئی ہو۔

یہ تینوں قسم کے حضرات تقلید کے معاملے میں ''عوام'' ہی کی صف میں شمار ہوں گے، اور تینوں کا حکم ایک ہی ہے۔ اس قسم کے عوام کو ''تقلید محض'' کے سوا چارہ نہیں، کیونکہ ان میں اتنی استعداد اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ براہِ راست کتاب وسنت کو سمجھ سکیں، یا اس کے متعارض دلائل میں تطبیق و ترجیح کا فیصلہ کر سکیں۔ لہٰذا احکامِ شریعت پر عمل کرنے کے لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ کسی مجتہد کا دامن پکڑیں اور اس سے مسائلِ شریعت معلوم کریں۔ (ص:۸۵، ۸۶)

اس درجے کے مقلد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ دلائل کی بحث میں اُلجھے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ کون سے فقیہ و مجتہد کی دلیل زیادہ راجح ہے؟ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کسی مجتہد کو متعین کر کے ہر معاملے

میں اسی قول کے پر اعتماد کرتا رہے۔ کیونکہ اس کے اندر اتنی استعداد موجود نہیں ہے کہ وہ دلائل کے راجح و مرجوح ہونے کا فیصلہ کر سکے۔ بلکہ ایسے شخص کو اگر اتفاقاً کوئی حدیث ایسی نظر آجائے جو بظاہر اس کے امام مجتہد کے مسلک کے خلاف معلوم ہوتی ہو، تب بھی اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی امام و مجتہد کے مسلک پر عمل کرے، اور حدیث کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ اس کا صحیح مطلب میں نہیں سمجھ سکا، یا یہ کہ امام مجتہد کے پاس اُس کے معارض کوئی قوی دلیل ہوگی۔

.....اور اگر ایسے مقلد کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف پا کر امام کے مسلک کو چھوڑ سکتا ہے، تو اس کا نتیجہ شدید افراتفری اور سنگین گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط ایک ایسا وسیع وعمیق فن ہے کہ اس میں عمریں کھپا کر بھی ہر شخص اس پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔ (ص:۸۷)

جو لوگ کتب حدیث کے اُردو تراجم میں حدیث کے ظاہری الفاظ دیکھ کر عمل کرنے سے جس غلط فہمی و گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں، کی مثالیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ: یہ دو مثالیں محض نمونے کے طور پر پیش کر دی گئیں، ورنہ ایسی احادیث ایک دو نہیں بیسیوں ہیں، جن کو قرآن وسنت کے علوم میں کافی مہارت کے بغیر انسان دیکھے گا تو لامحالہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگا۔ اسی بناء پر علماء نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے علمِ دین باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو، اُسے قرآن وحدیث کا مطالعہ ماہر استاذ کی مدد کے بغیر نہیں کرنا چاہیے۔ (ص:۹۱)

ہمارے فقہاء نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ عوام کو براہِ راست قرآن وحدیث سے احکامِ شریعت معلوم کرنے کے بجائے علماء وفقہاء کی طرف رجوع کرنا چاہیے، بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر کسی عام آدمی کو کوئی مفتی غلط فتویٰ دے دے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا، عام آدمی کو معذور سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر عام آدمی کوئی حدیث دیکھ کر اس کا مطلب غلط سمجھے اور اس پر عمل کر لے، تو وہ معذور نہیں ہے، کیونکہ اس کا کام کسی مفتی کی طرف رجوع کرنا تھا، خود قرآن وسنت سے مسائل کا استنباط اس کا کام نہ تھا۔ (ص:۹۲،۹۳)

(۲) متبحر عالم کی تقلید:

''متبحر عالم'' سے ہماری مراد ایسا شخص ہے جو اگرچہ رُتبۂ اجتہاد تک نہ پہنچا ہو، لیکن اسلامی علوم کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرنے کے بعد انہی علوم کی تدریس وتصنیف کی خدمت میں اکابر علماء کے زیرِ

نگرانی عرصۂ دراز تک مشغول رہا ہو، تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے اصول اسے مستحضر ہوں، اور وہ کسی مسئلے کی تحقیق میں اسلاف کے افادات سے بخوبی فائدہ اُٹھا سکتا ہو، اور ان کے طرزِ تصنیف واستدلال کا مزاج شناس ہونے کی بناء پر ان کی صحیح مراد تک پہنچ سکتا ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ایسے شخص کو ''متبحر فی المذہب'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔..... ایسا شخص بھی اگرچہ رُتبۂ اجتہاد تک نہ پہنچنے کی وجہ سے مقلد ہی ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے مذہب کا مفتی بن سکتا ہے، ایسے شخص کی تقلید عوام کی تقلید سے کچھ امور میں مختلف ہوتی ہے۔ (ص:۹۴، ۹۵)

ایک متبحر عالم کن شرائط کے ساتھ حدیثِ صحیح کی بنیاد پر اپنے امام مجتہد کے قول کو چھوڑ سکتا ہے؟

علمائے اُصولِ فقہ کی کتب سے اُن شرائط کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ: علمائے اُصول کی مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں ایک متبحر عالم اگر کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں اور ان کے دلائل کا احاطہ کرنے کے بعد کم از کم اُس مسئلہ میں اجتہاد کے درجہ تک پہنچ گیا ہو (خواہ وہ پوری شریعت میں مجتہد نہ ہو) تو وہ یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ میرے امام مجتہد کا مسلک فلاں حدیثِ صحیح کے خلاف ہے۔ ایسے موقع پر اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ امام کے قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرے۔ (ص:۱۰۴)

لیکن اس طرح جزوی طور پر اپنے امام سے اختلاف کرنے کے باوجود مجموعی طور پر اُسے مقلد ہی کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سے فقہاءِ حنفیہ نے اسی بناء پر امام ابوحنیفہ کے قول کو ترک کر کے دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ (ص:۱۰۷)

تنبیہ: البتہ یہ مسئلہ انتہائی نازک ہے، اس لیے اس میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، اور ہر شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو متبحر علماء کی صف میں شمار کر کے اس منصب پر فائز ہو جائے، اور اُوپر جو شرائط بیان کی گئی ہوں اُن کی رعایت رکھے بغیر احکامِ شرعیہ میں تصرف شروع کر دے۔ (ص:۱۰۸)

(۳) مجتہد فی المذہب کی تقلید:

''مجتہد فی المذہب'' اُن حضرات کو کہتے ہیں جو استدلال واستنباط کے بنیادی اُصولوں میں کسی مجتہد مطلق کے طریقے کے پابند ہوتے ہیں، لیکن اُن اصول وقواعد کے تحت جزوی مسائل کو براہِ راست قرآن وسنت اور آثارِ صحابہ وغیرہ سے مستنبط کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایسے حضرات اپنے مجتہد مطلق سے بہت سے فروعی احکام میں اختلاف رکھتے ہیں، لیکن اصول کے لحاظ سے اس کے مقلد کہلاتے ہیں۔ مثلاً: فقہ

حنفی میں امام ابو یوسف اور امام احمد، فقہ شافعی میں امام مزنی اور امام ابوثور، فقہ مالکی میں سحنون اور ابن القاسم، اور فقہ حنبلی میں ابراہیم الحربی اور ابوبکر الاثرم (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔.....لہٰذا مجتہد فی المذہب اصول کے لحاظ سے مقلد اور فروع کے لحاظ سے مجتہد ہوتا ہے۔ (ص:۱۰۸،۱۰۹)

(۴) مجتہد مطلق کی تقلید:

''مجتہد مطلق'' وہ شخص ہے جس میں تمام شرائط اجتہاد پائی جاتی ہوں اور وہ اپنے علم وفہم کے ذریعہ اصولِ استدلال بھی خود قرآن وسنت سے وضع کرنے پر قادر ہو اور ان اصول کے تحت تمام احکامِ شریعت کو قرآنِ کریم سے مستنبط بھی کرسکتا ہو، جیسے: امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔ یہ حضرات اگرچہ اصول اور فروع دونوں میں مجتہد ہوتے ہیں، لیکن ایک طرح کی تقلید ان کو بھی کرنی پڑتی ہے، اور وہ اس طرح کہ جن مسائل میں قرآنِ کریم یا سنتِ صحیحہ میں کوئی تصریح نہیں ہوتی وہاں یہ حضرات اکثر و بیشتر اس بات کی کوشش کرے ہیں کہ خالصۃً اپنی رائے اور قیاس سے فیصلہ کرنے کے بجائے صحابہ و تابعین میں سے کسی کا کوئی قول یا فعل مل جائے، چنانچہ اگر ایسا کوئی قول وفعل مل جاتا ہے تو یہ حضرات بھی اس کی تقلید کرتے ہیں۔ (ص:۱۰۹،۱۱۰)

تمام ائمہ مجتہدین نے اجتہاد کی شرائط کو پورا کرکے قرآن وحدیث کی صحیح مراد معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے سب کے مذاہب برحق ہیں، اور اگر کسی سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے تو اللہ کے نزدیک وہ نہ صرف معاف ہے بلکہ اپنی کوشش صرف کرنے کی وجہ سے مجتہد کو ثواب ہوگا جس کی تصریح احادیث میں موجود ہے۔ البتہ ایک مقلد یہ اعتقاد رکھ سکتا ہے کہ میرے امام کا مسلک صحیح ہے مگر اس میں خطا کا بھی احتمال ہے، اور دوسرے مذاہب میں ائمہ سے اجتہادی خطا ہوئی ہے لیکن ان میں صحت کا بھی احتمال ہے۔ (ص:۱۵۷)

فرقۂ ناجیہ اہلِ سنت والجماعت کے اتباع ہی میں نجات ہے:

امامِ ربّانی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ (م۱۰۲۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

''ان بزرگانِ دین کے اتباع کے بغیر نجات حاصل ہونا محال ہے، اور اگر بال برابر بھی ان کی مخالفت ہے تو خطرہ ہی خطرہ ہے، یہ بات صحیح کشف اور صریح الہام کے ساتھ بھی یقین کے درجہ کو پہنچ چکی ہے، اس میں کسی قسم کے اختلاف کا شبہ وگنجائش نہیں ہے۔

پس اس شخص کے لیے خوشخبری ہے جس کو ان کی پیروی کی توفیق حاصل ہوئی اور ان کی تقلید سے مشرف ہوا، اور اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جس نے ان کی مخالفت کی اور ان سے منحرف ہو گیا اور ان کے اُصولوں سے رُوگردانی کی اور ان کے گروہ سے نکل گیا۔ لہٰذا وہ لوگ خود بھی گمراہ ہوئے اور انھوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا''۔ (مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی: ۱/۱۹۱، دفتر اوّل، مکتوب: ۵۹)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو سمجھنے اور اس کی اتباع کی توفیق بخشے، باطل کو باطل قرار دینے اور اس سے اجتناب کی ہمت عطا فرمائے، اور ہم آپس کی خانہ جنگیوں کے بجائے دین کے بلند مقاصد کے لیے اپنی زندگیاں خرچ کر سکیں، آمین ثم آمین۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

.....☆.....